اردو شاعری کا فنی ارتقا

فرمان فتحپوری، لاہور، الوقار پبلی کیشنز- ۲جلدی، ۲۰۰۳، ۵۵۹ صفحہ.

علی بیات[۱]

اس سے پہلے کہ خود کتاب کے بارے میں مزید وضاحت پیش کی جائے، یہ ضروری ہے کہ فاضل مؤلف کے بارے میں مختصر الفاظ میں تعارف پیش کیا جائے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری جن کا اصل نام سید دلدار علی ہے، ہندوستان کے قصبہ فتح پور ہسوہ میں ۱۹۲۶میں پیدا ہوئے۔ آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے، ایل ایل بی اور بی ایڈ کیا۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے کی ڈگری لی اور بعد از اس اسی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی اور ڈی لٹ کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۵۸میں کراچی یونیورسٹی میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱میں زبان اور رسم الخط کے عنوان سے لکھنؤ سے اشاعت پذیر ایک رسالہ، "نگار" میں مقالات لکھ کر علمی وادبی دنیا سے متعارف ہوئے۔ انھوں نے ڈیڑھ سو سے زائد مضامین اور قریباً ۳۵ کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں ۱-تدریس اردو، ۲-اردو رباعی کا فنی وتاریخی ارتقا ۳- تحقیق و تنقید ۴- غالب شاعر امروز وفردا، ۵-اردو کی منظوم داستان، ۶-تاویل و تعبیر، ۷-اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ۸-زبان اور اردو زبان، ۹-اردو املا اور رسم الخط، ۱۰-اردو کی بہترین مثنویاں (اردو انسائیکلو پیڈیا، چوتھا ایڈیشن، ۲۰۰۵، ص۱۰۵۱) وغیرہ ان کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی کتاب "اردو ادب کی فنی تاریخ" کی ۲۰۰۳ء والی اشاعت کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ "اردو نثر کا فنی ارتقا" اور دوسرا حصہ "اردو شاعری کا فنی ارتقا" ہے۔ اس مضمون میں، دوسرے حصے کا مطالعہ مطلوب ہے۔ دراصل یہ ان کی اپنی طبع زاد کتاب نہیں ہے۔ بلکہ کل ۳۷ مضامین کا ایک مجموعہ ہے جن میں سے ۶ مضامین ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے اور باقی دیگر محققوں اور مصنفوں کے ہیں۔ یہ کتاب شاعری اور اس کے تدریجی ارتقا کا ایک مطالعہ ہے، جو زمانہ تألیف تک کے مختلف مصنفوں کی اردو اصناف نظم کے بارے میں مضامین وخیالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں

---

۱. ایسو سی ایٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف تہران.

اردو شاعری کی سولہ اصناف کا احاطہ کیا گیا ہے اور ہر ایک صنف کے لیے مختلف مصنفوں اور دانشوروں کے خیالات درج ہیں۔ البتہ شروع میں مؤلف نے تین صفحوں پر مشتمل "کتاب سے پہلے" کے عنوان کے تحت، اردو شاعری پر بڑے اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ذیل میں اس کی فہرست پیش خدمت ہے:

"غزل" کے ذیل ۷ مضامین موجود ہیں۔ غزل اردو شاعری کی جان اور آبرو سمجھی جاتی ہے۔ اس حصے میں مشہور نامور اور ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔ **"نظم"** کے مطالعے کے لیے، چار مضامین دیئے گئے ہیں۔ **"مثنوی"** کا مطالعہ تین مضامین کے ذیل میں کیا گیا ہے۔ جن میں سے دو مضامین خود فاضل مؤلف کے ہیں۔ **"قصیدہ"** کی صنف کا مطالعہ چار مضامین کے تحت کیا گیا ہے۔ **"مرثیہ"** کے مطالعے کے لیے دو مضامین دیئے گئے ہیں۔ **"رباعی"** کی صنف کے مطالعے کے لیے خود ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا مضمون "اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقا" ہے۔ **"واسوخت"** کی صنف کے لیے تین مضامین دیئے گئے ہیں۔ **"ریختی"** کے سلسلے میں تین مضامین دیئے گئے ہیں۔ **"قطعہ"** کی صنف کے مطالعے کے لیے پھر فاضل مؤلف، ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے ایک ہی مضمون "قطعہ اور اس کے مماثل اصناف" پر قناعت کر لی گئی ہے۔ **"گیت"** کی صنف کے مطالعے کے لیے، اظہر علی فاروقی کا مضمون "اردو گیت"، اس سلسلے کا واحد مضمون ہے۔ **"شہر آشوب"** کی صنف کی، سید مسعود حسن رضوی ادیب کے مضمون "شہر آشوب کا فن اور موضوع" کے تحت وضاحت کی گئی ہے۔ **"منظوم ڈرامہ"** کے لیے دو مضمون دیئے گئے ہیں۔ **"سانٹ"** [کذا] کی صنف کے بارے میں دو مضامین موجود ہیں۔ **"دوہا"** ایک اور صنف ہے جس کے بارے میں سلیم جعفر کا مضمون "دوہا اور اس کی فنی خصوصیات" اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ **"پیروڈی"** کی صنف کی وضاحت، فضل جاوید کے مضمون "اردو میں پیروڈی" سے کی گئی ہے۔ آخری صنف جس کے بارے میں اس کتاب میں بات کی گئی ہے، جاپانی شاعری سے ماخوذ **"ہائیکو"** کی صنف ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا مضمون "اردو میں ہائیکو" اس صنف پر واحد مضمون ہے۔

کتاب کی تالیف کا مقصد

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اردو ادب نے اپنی ترقی کی ہر منزل میں فارسی، عربی اور ہندی ادب سے مکمل طور پر فائدہ اٹھایا ہے اور کلاسیکی دور میں عربی و فارسی کی تقریبا تمام اصناف نے اردو ادب میں راہ پائی ہے۔ ہندوستان کی مقامی اصناف شعر بھی کسی نہ کسی شکل میں اردو ادب میں شامل ہو گئی ہیں، جن میں سے گیت اور دوہا قابل ذکر ہیں۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کے ادیبوں نے بعد کے ادوار میں اپنی تمامتر توانائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے،

اردو ادب کا دامن وسیع تر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جدید دور میں خاص طور پر انیسویں صدی کے اخیر سالوں میں اور بیسویں صدی کے آغاز سے انگریزی ادب کے اثرات نے اردو ادب کے میدان کو اور وسعت بخشی اور بہت سی اصناف نثر کے ساتھ ساتھ اصناف نظم میں بھی نئی اصناف سامنے آئیں، جن میں سے سانیٹ، پیروڈی اور منظوم ڈرامہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح دیگر دور دراز ممالک کے ادب کے اثرات بھی اردو میں نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر جاپانی زبان کی صنف نظم "ہائیکو" قابل ذکر ہے۔

تعلیمی مراکز میں اصناف شعر کو طلباء کو سمجھانے اور بہتر طریقے سے تدریس کے فرائض سرانجام دینے کے لیے کسی ایسی کتاب کی ضرورت ہوتی ہے جس میں ایک ایک اصناف کی صحیح تدریس و تفہیم کی جاسکے۔ یقیناً فاضل مؤلف کو بھی اس کمی کا احساس ہو گیا تھا اور اس کمی کے ازالے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہ سوجھا ہوگا کہ مضامین کا ایک ایسا مجموعہ، موجودہ شکل میں اکٹھا کیا جائے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اردو اصناف شاعری کے پس منظر کی مختصر وضاحت کے بعد، اس کتاب کے بارے میں یوں لکھتے ہیں: "ان ساری اصناف کی اپنی ایک تاریخ ہے، اپنا ایک فن ہے، ایک اسلوب ہے، ایک معیار ہے اور بہ اعتبار مقدار بھی قابل توجہ ہے... اگر کوئی شخص جاننا چاہے کہ ان اصناف کی تکنیک، ہیئت، خصوصیات اور فنی لوازم کیا ہیں اور یہ ارتقا کی کن کن منزلوں سے گزری ہیں تو کسی ایک جگہ یا کسی ایک کتاب میں ان کی تفصیلات نہ مل سکیں گی۔ یہی وہ کمی یا ضرورت تھی جسے زیر نظر کتاب کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں اردو شاعری کی جملہ معروف اصناف کے بارے میں وہ ساری تفصیلات، مستند حوالوں کے ساتھ دے دی گئی ہیں جن کی کسی شخص کو تعلیمی و تدریسی یا عام مطالعاتی سطح پر ضرورت پڑ سکتی ہے۔" (فتحپوری ص۸-۷) اسی ضرورت کے پیش نظر، تہران یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے مذکورہ کتاب کو اپنے نصاب میں شامل کر دیا ہے تاکہ جس طرح ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے، اردو اصناف شعر کے بارے میں ساری تفصیلات ایک مجموعے میں اساتذہ اور طلباء کے لیے میسر ہو جائیں۔

"کتاب سے پہلے" کا آخری پیرا اس کتاب کے بارے میں مزید وضاحت پیش کرتا ہے۔ دیکھیے: "یہ کتاب جیسا کہ فہرست مضامین سے قارئین کو اندازہ ہوگا، اردو شاعری کے جملہ اصناف و فنی اسالیب کا احاطہ کرتی ہے اور اردو کے معتبر و موقّر اہل قلم کے مقالات پر مشتمل ہے۔ ہر چند پاک و ہند سے کئی بار شائع ہوئی ہے، پھر بھی اس کی طلب و مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ ایک عرصے سے کمیاب و نایاب ہے۔ اس لیے الوقار پبلی کیشنز لاہور کی معرفت، تازہ رنگ و روپ کے ساتھ منظر عام پر آ رہی ہے۔ یقین ہے قدر و پسند کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔" (ہمان ۸) اس اقتباس سے بہت اہم نتائج

اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ کتاب کی یہ شکل جو ہمارے پیش نظر ہے اور نثر و نظم اردو کا ارتقاء کے حصے اس وقت ایک جلد میں "اردو ادب کی فنی تاریخ" کے نام سے شائع ہوئے ہیں، اس سے قبل، الگ الگ کتابوں کی شکل میں کئی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئے تھے۔ اگرچہ انہوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ کب اور کہاں سے یہ کام سرانجام ہوا ہے۔

اس کتاب کے موضوع کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سے قبل یا اس کے ہوتے ہوئے کئی اور کتابیں قارئین کے دسترس میں تھیں یا اب بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر:

١. کشاف تنقیدی اصطلاحات از ابوالاعجاز حفیظ صدیقی
٢. اردو کی قدیم اصناف شعر از ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا
٣. اصناف سخن اور شعری ہیئتیں از شمیم احمد
٤. اصول انتقاد ادبیات از سید عابد علی عابد
٥. بحر الفصاحت از نجم الغنی
٦. اصناف ادب از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
٧. منتخب ادبی اصطلاحیں از ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری
٨. ادبی اصطلاحات از انور جمال

مذکورہ کتابوں کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان میں سے ہر ایک کو دوسری کتاب سے تقابل کرنا صحیح کام ہوگا۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ یقیناً ہر ایک کتاب کے بہت سے محاسن اور بعض کمزوریاں بھی ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود زیر بحث کتاب کا ایک بڑا حسن یہ ہے کہ اس کی مدد سے تعلیمی و تدریسی نقطہ نظر سے اردو اصناف شعر سے مکمل تعارف کے ساتھ ساتھ ان کے ارتقائی مدارج اور اسالیب کا یکجا طلباء کو سمجھایا جا سکتا ہے۔

کتاب کے موضوعات کا مطالعہ اور اس کی اہمیت

فاضل مؤلف نے اس کتاب کے موضوعات کی اہمیت کے پیش نظر، مختلف مضامین سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مثال کے طور پر "غزل" کو دیکھیے۔ اس کے لیے سات مضامین مختص ہوئے ہیں۔ مضامین کے عناوین اور ان کے مصنفوں کے نام سے موضوع کی اہمیت کا پتہ چل سکتا ہے۔ پہلا مضمون کا عنوان "شعر کیا ہے" ہے۔ اس میں پروفیسر عبدالقادری نے مختلف انگریزی، فارسی اور عربی دانشوروں کے اقوال و تصانیف کی مدد سے شعر کی ایک تعریف دینے کی کوشش کی ہے۔ مثال

کے طور پر ڈاکٹر جانسن ، لے ہنٹ، ورڈسورتھ ، میتھیو آرنلڈ، ایڈ گر آلن پو، ابن سینا، قاضی عبدالعزیز جرجانی، غلا معلیٰ آزاد بلگرامی وغیرہ کے اقوال کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ : " شعر کی تعریف میں تمام نازک خیالیوں اور مکررات کو دور کرنے کے بعد جو چیزیں بچ جاتی ہیں، اس سی شعر کے بنیادی عناصر ضرور معلوم ہو جاتے ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ شعر چونکہ آرٹ ہے، اس لیے اس میں زبان اور اسلوب کی نزاکت اور خوبی کا موجود ہونا ضروری ہے، جس سے جذبات خاص طور پر متاثر ہوتے ہیں..." (فتحپوری ۱۳) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے بھی شعر کی تعریف میں قاضی عبدالعزیز جرجانی اور غلا معلیٰ آزاد بلگرامی وغیرہ کے خیالات کا ذکر کیا ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی، ۱۴) گواس مضمون کا براہ راست غزل سے کوئی تعلق نہیں اور اس کو ایک الگ عنوان کے تحت دیا جا سکتا تھا، لیکن یہاں طلباء کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے، یہ مضمون بھی دیا گیا ہے۔

دوسرا مضمون " غزل کی ماہیت و ہیئت " از پروفیسر فراق گور کھپوری (۱۸۹۶ء-۱۹۸۸ء) ہے۔ یہ خود اردو کے مشہور نقاد اور شاعر تھے اور غزل سے بڑی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس مضمون میں مختلف شعرا کے کلام کی مدد سے غزل کا ادبی و تہذیبی ماہیت کی وضاحت کی بڑی اچھی کوشش کی ہے۔ غزل کی ماہیت سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں " غزل و ماہیت تہذیب و انسانیت کے مرکزی جمالیاتی و وجدانی تجربات کی اس ماہیت و اصلیت میں پوشیدہ ہیں، جہاں عقلی، اخلاقی، جمالیاتی حقیقتوں کا ایک ماورائی عالم میں یا لامحدود کی مرکز پر سنگم ہوتا ہے۔ غزل کا ہر ایک شعر ایک روحانی دور کامل ہوتا ہے۔ " (فتحپوری ۱۷) وہ آگے جا کر غزل کے موضوع کے بارے میں لکھتے ہیں " زندگی کی مرکزی اور اہم حقائق مسائل غزل کے موضوع ہوتی ہیں۔ ان حقائق میں واردات عشق کو اولیت حاصل ہے، کیونکہ انسانی تہذیب کے ارتقا میں جنسیت اور اس سے پیدا ہونی والی کیفیتوں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ " (ہمان ۱۸)

تیسرا مضمون " شعر اور غزل " از پروفیسر مجنون گور کھپوری (۱۹۰۴ء-۱۹۸۸ء) ہے۔ وہ اردو دب کے مشہور نقادوں اور افسانہ نویسوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اس مضمون میں پہلے شعر اور شاعر کے بارے میں بات کرتے ہیں اور مختلف انگریزی دانشوروں کے اقوال کا ذکر کرکے، ایک جگہ لکھتے ہیں " ہمارا یہ خیال بے بنیاد ہے کہ شاعری سکون، تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کا نتیجہ ہے۔ شاعری تاثر اور تفکرت کا نتیجہ ہے اور تاثر و تفکر خارجی دنیا کے ساتھ مقابلہ اور کائنات کے مطالعہ کے نتائج ہیں..." (ہمان، ۳۸) مختلف ممالک اور تہذیبوں میں شاعری کے بارے میں بڑی لمبی بحث کے بعد وہ غزل کی طرف لوٹ آتے ہیں اور غزل کے لیے کچھ خصوصیات گنواتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ نمبر ایک خصوصیت یہ کہتے ہیں " اصلی غزل وہ ہے جس کے اشعار میں عشق و محبت کی فضا چھائی ہو، جس میں سپردگی اور خود گدا ختگی کا احساس

حمیّت اور خود داری کے مقابلہ میں زیادہ ہو۔۔۔" (ہمان ۵۲) لیکن آگے جا کر غزل کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں"۔۔۔غزل کو خاص عشقیہ شاعری کا مترادف سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ تاریخ میں ایسا نہیں۔ غزل کے بنیادی یا لغوی مفہوم جو بھی ہو ایک صنف شاعری کی حیثیت سے مضامین اور اسالیب دونوں میں اس سے زیادہ وسعت اور تنوع کا امکان کسی دوری صنف میں نہیں۔ فارسی اور اردو غزل کے اچھے نمونوں کو سامنے رکھئے تو قائل ہونا پڑے گا کہ غزل کے مضامین اتنے ہی وسیع اور متنوع ہیں جتنے کہ خود انسان کی زندگی کے حالات و واردات۔" (ہمان ۵۳) اسی طرح وہ غزل کے بارے میں طویل بحث کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کا مضمون "غزل کا نیا رنگ ترنم" ایک مختصر مضمون ہے جس میں اردو غزل میں ترنّم اور رنگ تغزل کا، داغ دہلوی، حسرت موہانی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی وغیرہ کے ہاں مطالعہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے مضمون "غزل کا فن" میں غزل کے اجزائے ترکیبی یعنی "(۱) مطلع، (۲) ردیف، (۳) قافیہ، (۴) مقطع اور (۵) بحر" (فتحپوری، ۷۹) ہر ایک کی ضرورت اور محاسن کے بارے میں بات کی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں "ردیف کا قافیہ سے اتّصال غزل کا بڑا نازک مقام ہے۔ بعض اوقات فصاحت و بلاغت کے نازک ترین مرحلوں سے یہاں گزرنا پڑتا ہے، محاورات زبان کی لطیف ترین شکلوں کا استعمال اس جگہ ملتا ہے۔۔۔" (ہمان، ۸۱) شمیم احمد "غزل اور غزل کے معاملات" میں نظم و غزل کا تقابل کرتے ہوئے غزل کی برتری کے بارے میں یوں لکھتے ہیں" میرا یہ دعوی ہے کہ غزل سے وہی شخص لطف اندوز ہو سکتا ہے جو نہ صرف خود اگاہ ہو، بلکہ تہذیب نفس کی بہترین سطح پر فائز ہو جبکہ نظم سے کم فہم افراد اور معمولی اہلیت اور استعداد کے ان گھڑ بھی فیض اٹھالیتے ہیں۔" (ہمان، ۹۵) آگے جا کر وہ ایک سؤال اٹھالیتے ہیں کہ "آج کل کے نوجوان طالب علم اور اردو پر پوری قدرت نہ رکھنے والے افراد کیوں غزل سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے اور اس نااہلیت کے وجوہ کیا ہیں؟اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ غزل انتہائی مہذب اور خیال کے بنیادی تاثر کی سب سے ارتقاپذیر شکل کا نام ہے۔" (ہمان) بہ ہر حال یہ تقابل اور مطالعہ جاری رہتا ہے۔ غزل کے بارے میں اس کتاب میں آخری مضمون "اردو غزل ولی سے عہد حاضر تک" خود ڈاکٹر فرمان فتحپوری سے ہے۔ انہوں نے اپنے اس مضمون میں اردو غزل کا ولی دکنی سے لے کر عہد حاضر تک عہد بہ عہد اور ان پر مسلّط رجحانات کا بڑے اختصار کی ساتھ، لیکن نکتہ رس جائزہ لیا ہے۔ وہ اردو غزل میں انحراف کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں" غزل کے روایتی اشارات تو نہیں لیکن معنی واسلوب بیان کی حیثیت سے کلاسکل غزل گوئی سے انحراف کی ابتدا غالب سے ہوئی۔ غالب کا یہ اقدام ایک طرح غیر شعوری اقدام تھا، جس کی اہمیّت سے وہ خود بھی واقف نہ تھے۔ لیکن حالی نے اس باب

میں جو کچھ کیا وہ قصیدہ وارادہ سے متعلق تھا اور یہ قصیدہ وارادہ ان میں زمانہ کے حالاتو رجحانات کی زیر اثر پیدا ہوا۔" (ہمان، ۱۳۲) بیسویں صدی کے نصف میں جدید دور کی شاعری کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ "جنگ عظیم کے بعد ملک میں آزادی کے جذبات زیادہ اُبھرے اور مسائل اقتصاد و معاشرت نے زیادہ اہمیت حاصل کی تو شاعری کا دور جدید شروع ہوا۔ اس دور میں بعض حضرات نے کلاسکل شاعری کو بالکل مردود قرار دیا اور غزل کے اسلوب و ہیئت کو بدل کر مغرب کی اتّباع میں نظمیں کہنا شروع کیں" (ہمان ، ۱۳۳) ڈاکٹر صاحب کی اس رائے کے بعد کتاب میں دوسری صنف یعنی نظم کے بارے دئے گئے مضامین کا جائزہ لیا جائے گا۔

نظم کے تحت چار مضامین درج ہیں۔ پہلا مضمون آل احمد سرور کا " نظم کی دنیا" ہے۔ ان کے خیال میں اردو میں نظم نگاری میں "حالیؔ، شبلیؔ کے بعد، اسمٰعیلؔ، اکبرؔ، چکبستؔ، اقبالؔ، سلیمؔ، سرورؔ جہان آبادی، شوقؔ قدوائی اور بے نظیرؔ شاہ کے نام ممتاز ہیں۔" (ہمان، ۱۳۴) لیکن کلی طور ر نظم کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ "ابھی یہ صنف اردو میں بالکل نووارد ہے۔ اسے ہمدردی اور رواداری سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے شعرا کی فطرت ہم آہنگ ہو سکی تو اس اردو کو یقیناً فائدہ پہونچے گا۔ ورنہ اپنے آپ ختم ہو جائی گی۔" (ہمان، ۱۳۷) ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون " معرّیٰ نظم اور آزاد نظم کا ارتقا" اس سلسلے میں دوسرا مضمون ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں حالی اور آزاد کی نظم کے بارے میں کاوشوں کا مختصر الفاظ میں جائزہ لیا ہے۔ شروع میں آزاد نظم لکھنے والوں کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ "آزاد نظم لکھنے والوں کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ قافیہ ور دیف کی پابندی کے ساتھ بھی اچھی اور نئی شاعری کی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ روایت نے قافیہ کو غیر ضروری اہمیّت بخش دی ہے اور اکثر شاعر کا ذہن اپنے معنی کو بھول کر قافیے کی مناسبات میں گم ہو جاتا ہے۔" (ہمان، ۱۴۲) وہ اسی طرح آزاد نظم کی نشو و نما کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "اگر آزاد نظم کو ہیئت کے اعتبار سے کسی نے پورے طور پر برتا ہے وہ میراجیؔ ہیں۔" (ہمان،۱۵۱) بیشتر نظم نگاروں کی نظموں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ یہ سوٴال اٹھاتے ہیں کہ "آخر میں اس سوٴال پر غور کرنا ضروری ہے کہ آزاد اور معرّیٰ نظم نگاری کے امکانات اور اندیشے کیا ہیں اور ان کے پیش نظر ان کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی کی جا سکتی ہے یا نہیں ؟ " (ہمان، ۱۵۵) ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون " غزل اور نظم کا بنیادی فرق" تیسرا مضمون ہے۔ انہوں نے اپنے اس مضمون میں غزل اور نظم کے فرق بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں " غزل مشرق کی پیداوار ہے۔ مغرب میں اس کے نقوش مشکل ہی سے نظر آئیں گے۔ وہاں دوسری اصناف شعر بالخصوص نظم کو فروغ ملا ہے۔ مگر یہ فروغ کسی شعوری اقدام کے تابع نہیں، بلکہ یہ نتیجہ ہے اس مادی نقطہ نظر کا جس کے پس پشت سوچ کا خاص انداز

ہمیشہ بہت توانا رہا ہے۔" (ہمان،۱۵۹)انہوں نے اپنے مضمون میں غزل اور نظم کے مختلف زاویوں سے فرق بیان کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "غزل اور نظم کے فرق کو دو اور سطحوں میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان میں سے ایک سطح محبت کے موضوع سے متعلق ہے اور دوسری ہیئت کے سوال سے۔ شاعر جب نظم لکھتا ہے تو اپنی محبت کے اس تجربے کو بیان کرتا ہے جس کی مثال نہ پہلے موجود تھی اور نہ جس کا آئندہ وجود میں آ نا قرین قیاس ہے... لیکن غزل میں محبت کا تجربہ ایک اجتماعی اور عمومی کیفیت میں ڈھل جاتا ہے۔" (ہمان ۱۶۲) نظم کے بارے میں آخری مضمون انجم اعظمی کا "جدید نظم سے کیا مراد ہے" ہے۔ وہ سب سے پہلے جدید کے لفظ کے حقیقی معنی کی اہمیت اُجاگر کرنے کوشش کرتے ہیں۔ "جدید کے لفظ کو اہمیّت اس وقت دی جاسکتی ہے، جب وہ نئے کے ساتھ ساتھ کسی ایسے معنی کا بھی حال ہو جو زندگی کے ادراک میں ایک جہت کا اضافہ کررہا ہو..." (ہمان،۱۶۵) اس منظر سے وہ مجازؔ، فیضؔ، مخدومؔ، مدنیؔ اور اخترؔالایمان کو جدید شاعر مانتے ہیں۔ لیکن راشدؔ کو رد کرتے ہوئے میراجیؔ کو تو سرے سے شاعر نہیں مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "یوسف ظفرؔ، قیوم نظرؔ اور ضیاؔ جالندھری کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں ہے۔ انہیں میراجی کے معتقدین میں شمار کرنا بہتر ہوگا۔ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے،اسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ لوگ شعر صرف اس لیے لکھتے ہیں کہ میراجی نے شعر لکھے۔ میراجی جو بے چارے شعر لکھنا جانتے ہی نہ تھے۔" (ہمان، ۱٦٦) آگے جاکر وہ جدیدیت کے مفہوم کو نئے زاویوں سے سمجھانے کوشش کرتے ہیں۔

تیسری صنف "مثنوی" ہے۔ امیر احمد علوی کا مضمون "اردو کی مشہور مثنویاں"، اس سلسلے میں پہلا مضمون ہے۔ مثنوی کی مختصر تعریف کے بعد قطبؔ شاہ کی ایک مثنوی کا ذکر کرکے عادل شاہی دور سے لے کر مختلف ادوار میں مشہور مثنویوں کی بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا مضمون "سحر البیان کے پس منظر پر ایک نظر" دوسرا مضمون ہے۔ سحر البیان کی اہمیّت کے پیش نظر، انہوں نے اس مثنوی کا ایک مطالعہ پیش کیا ہے۔ سب سے پہلے اس مثنوی کی بحر کے بارے میں داد سخن دی ہے اور اس کے بعد سحر البیان کا کئی چند اور مثنویوں سے تقابل کیا ہے اور ان مثنویوں کا جن سے میر حسنؔ کے تاثر لینے کا امکان موجود ہے، کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے "گلزار نسیم کی نمایاں خصوصیات" کی نام سے ایک اور مضمون لکھا ہے اور سحر البیان کی طرح، اس کا بھی ایک مطالعہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس مثنوی کے ساتھ بعض ناانصافیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "مجموعی طور پر انتہائی اختصار کے باوجود کلام کی بے ربطی، ابہام، اشکال اور تعقید سے پاک ہے۔" (ہمان، ۱۹۲) اس مضمون کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ

اس مثنوی کا تنقیدی مطالعہ، سحر البیان کی بہ نسبت مصنف کے ذریعے سے بہتر صورت میں انجام پذیر ہوا ہے۔ یعنی کرداروں، واقعات، اسلوب بیان اور دیگر اوصاف کا بہتر تنقیدی مطالعہ ہوا ہے۔

"قصیدہ" کی تفہیم کے لیے چار مضامین دیئے گئے ہیں۔ پہلا مضمون "قصیدہ، صنف سخن کی حیثیت سے" از ابو محمد سحر ہے۔ مصنف نے قصیدہ کا لغوی معنی اور تعریف، اس کی ہیئت، اشعار کی تعداد، موضوع، اجزائے ترکیبی اور اس کی قسموں کے بارے میں وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر ضیاء احمد بدایونی کا مضمون "ایوان قصیدہ کے ارکان اربعہ" اس ضمن میں دوسرا مضمون ہے۔ انہوں نے قصیدہ کے لغوی مفہوم کے علاوہ، قصیدے کی تعریف اور مضوعات کی وضاحت کے بعد، سودؔا، ذوقؔ، غالبؔ اور مؤمنؔ کے قصائد اور ان کے موضوعات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ وہ سوؔدا اور ذوقؔ کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ قصیدہ گویوں میں ذوقؔ کا کیا درجہ ہے؟ اور اس صنف خاص میں ان کو سودؔا سے کیا نسبت ہے؟ ہمارے نزدیک اگرچہ سودؔا کو ان پر ترجیح ہے۔ تاہم وہ سودؔا کے کامیاب مقلد ہیں اور سودا کے بعد صنف قصیدہ میں انھیں کا مرتبہ ہے۔" (ہمان، ۲۲۸) اس سلسلے میں، "اردو قصیدہ اور مثنوی کی تنقید پر ایک نظر" از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تیسرا مضمون ہے۔ یہ دراصل اردو ادب کے مشہور نقاد کلیم الدین احمد کی، قصیدہ اور مثنوی پر تنقید کی تنقید ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "اگر کلیمؔ صاحب یہ کہتے کہ غزل کے مقابلے میں شعرا نے قصیدہ کی طرف توجہ کم کی، تو صحیح ہوتا۔ لیکن اس کی وجہ بھی قصیدہ کی دشواری نہیں، کیونکہ قصیدے سے زیادہ دشواری تو اس رنگ کی غزلیں کہنا ہے جو عرصہ تک اردو میں عام رہا۔" (ہمان، ۲۳۸) قصیدے کے بارے میں آخری مضمون "سودؔا اور ذوقؔ" از ڈاکٹر سلام سندیلوی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "جب کبھی اردو قصیدہ نگاری کا ذکر چھیڑتا ہے، تو سودؔا اور ذوقؔ کا نام بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اردو قصیدہ نگاری صرف سودؔا اور ذوقؔ کی ذات سے عبارت ہے۔" (ہمان، ۲۵۰) اس مضمون میں بھی ان دونوں اکابر کے قصیدوں کا تنقیدی و تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دونوں کے ہاں تشبیبوں کا تقابل یوں کیا ہے "سودؔا کی طرح ذوقؔ بھی تشبیب میں بہاریہ اور نشاطیہ مضامین لائے ہیں۔ مگر ذوقؔ کی تشبیب میں اس قدر بو قلمونی نہیں، جو سودؔا کی تشبیب کا طرہ امتیاز ہے۔" (ہمان ، ۲۵۲)

"مرثیہ" اردو میں بہت اہم صنف شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں اس کے بارے میں پہلا مضمون "اردو مرثیہ اور انیس"، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا ہے۔ انہوں نے اس مقالے میں یوں کہا ہے کہ "ہمارے اکثر اصناف سخن... عربی یا فارسی لئے گئے ہیں، لیکن مرثیہ ایسی صنف ادب ہے، جسے ہم نے کسی دوسری قوم یا اس کے ادب سے نہیں لیا۔ بلکہ اردو ہی میں اس کی بنیاد پڑی اور اسی زبان میں نشو و نما پا کر درجہ کمال کو پہونچی۔" (ہمان، ۲۵۹) مصنف نے کئی وجوہات

کی بناپر اردو مرثیہ کو اہم گردانا ہے۔ اس کے بعد، مرثیہ کی مذہبی اہمیت میں بہت سی دلائل دی ہیں۔ اردو مرثیہ نگاری کے بہترین شاعر، میر انیسؔ کے مرثیوں کا تنقیدی مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ میر ضمیرؔ کے مراثی کے مختلف زاویوں کے بارے میں بات کی ہے۔ میر ضمیرؔ کی مرثیہ نگاری کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں "میر ضمیرؔ نے یہ دیکھ کر مرثیہ میں ہر صنف ادب می کچھ خصوصیات پیدا کرنے کی گنجائش ہے، انہوں نے تمام اصناف سخن کو مرثیہ میں کھپا کر مرثیہ کو ایک نئی صنف بنادی۔" (ہمان، ۲۷۱) ڈاکٹر صفدر حسین (۱۹۱۹ء-۱۹۸۰ء) کا مضمون "اردو مرثیہ عہد بہ عہد" اس سلسلے میں دوسرا مضمون ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے ایران اور ہندوستان میں شیعی حکومتوں کی بات کی ہے۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ایک خاص دور میں " مغلیہ عہد حکومت میں بالخصوص زوال سلطنت کے وقت اپنے مسلک اور معتقدات کے اظہار میں زیادہ بے باک ہو گئے تھے اور شمال سے جنوب تک جہاں موقع ملا، خاص خاص فرقوں کی مذہبی رسموں کو آزادی نصیب ہو گئی تھی۔ اس لیے ذکر اہل بیت اور عزاداری حسین (ع) کے لیے بھی ماحول نہایت سازگار تھا۔" (ہمان، ۲۸۱) اس کے بعد بڑی تفصیل کے ساتھ اردو مراثی کا مختلف ادوار میں ذکر کیا ہے۔ ان کے خیال میں " اردو مرثیہ کی داغ بیل دکن کی عادل شاہی، قطب شاہی اور نظام شاہی حکومتوں میں پڑی تھی۔ پھر دکن کے علاوہ برہان پور اور گجرات میں جنوب میں بھی بہت اچھے مرثیہ گو پیدا ہو گئے تھے اور اس طرح تقریباً دو صدی میں جنوب میں مرثیہ نے وہ تمام مدارج طے کر لئے تھے جو دکنی نوحہ سے شروع ہو کر سوداؔ کے عربی مرثیہ تک پہنچتے ہیں۔" (ہمان، ۲۸۳) آگے جا کر وہ بہت سے مرثیہ گو شعرا کے مراثی ک جائزہ لیتے ہوئے، قدم قدم پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"رباعی" کی صنف کی وضاحت کے لیے خود ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا اپنا مضمون "اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء" ہی کتاب میں موجود ہے۔ انہوں نے رباعی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بات کرنے کے بعد، اس کے اوزان کے بارے میں تفصیل سے بات کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ " اردو کے دوسرے اصناف سخن، قصیدہ، مثنوی اور غزل کی طرح رباعی بھی فارسی اردو میں آئی ہے... اردو شاعری کے بالکل ابتدائی دور میں بھی رباعیاں کہی جاتی تھیں۔ چنانچہ اردو کے پہلے با دیوان شاعر، محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸-۱۰۲۰ھ) کے کلیات میں متعدد رباعیاں موجود ہیں۔" (ہمان، ۳۱۳) ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس مضمون میں پرانے زمانے سے لے کر عہد حاضر تک کے رباعی گو شعرا کی رباعیوں کا جائزہ لیا ہے اور اختصار کے ساتھ ہر ایک کے بارے میں داد سخن دی ہے۔ مثال کے طور پر وہ میر تقی میر کی رباعیوں کے بارے میں یوں کہتے ہیں " میر تقی میرؔ کی کلیات... میں سوا سو کے قریب رباعیاں موجود ہیں۔ بعض میں محض شاعرانہ تعلّی کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن اکثر رباعیاں خالص عشقیہ ہیں جن میں میرؔ کی غزل کی شان نمایاں ہے۔" (ہمان، ۳۱۵) وہ دور حاضر کو اردو

رباعی کے دور عروج کا نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "حالیؔ واکبرؔ کے زیر اثر اکثر شعرا اس طرف متوجہ ہوئے اور چند ہی دن میں رباعیات کے پورے پورے مجموعے منظر عام پر آنے لگے۔" (ہمان ۳۲۳)

"واسوخت" کی صنف کے لیے تین مضامین سے مدد لی گئی ہے۔ پہلا مضمون "اردو کا پہلا واسوخت" از سید شاہ ولی۔الرحمٰن ولیؔ ایم۔اے سے ہے۔ انہوں نے اس مضمون میں تاریخی شواہد کی مدد سے اردو کے پہلے واسوخت کی نشاندہی کی کوشش کی ہے۔ وہ یوں سوال اٹھاتے ہیں کہ "لیکن سوال یہ ہے کہ اردو میں پہلے واسوخت کا سہرا کس کا سر؟...ابھی تک دنیا یہ جانتی تھی کہ اردو میں سب سے پہلے میرؔ نے واسوخت لکھا۔ لیکن قاضی صاحب [عبدالودود] نے تحقیق کا قدم آگے بڑھایا ہے اور یہ ثابت کرنے کوشش کی ہے کہ اردو میں واسوخت کے موجد شاہ مبارک آبرؔو تھے۔" (ہمان، ۳۳۱) آگے جاکر کچھ دیگر شعرا کے ہاں واسوختوں کا ایک مختصر مطالعہ پیش کیا ہے۔شعیب اعظمی کا مضمون" اردو واسوخت "اس سلسلے میں دوسرا مضمون ہے۔ شعیب اعظمی شروع میں مختلف تذکروں کی مدد سے واسوخت کی پیدائش اور اس کا وحشی بافقی (جس کو اردو محققین اکثر وحشی یزدی کہتے ہیں) سے تعلق کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اس کے بعد اردو میں پہلے واسوخت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور سید شاہ ولی الرحمٰن ولیؔ ایم۔اے کی طرح وہ بھی میر تقی میرؔ سے اردو کے اولین واسوخت منتسب کرنے کے بارے میں دلائل پیش کرتے ہیں۔اس کے بعد مختلف شعرا کے واسوختوں اور ان کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں" میرؔ سے پہلے کے واسوختوں کے تمام اشعار میں معشوق سے گلہ، شکوہ اور بے توجہی کا رونا ہے یا سوداؔ کی طرح طعن و تشنیع ہے۔ لیکن میرؔ کی واسوختوں میں یہ جدّت پائی جاتی ہے کہ انہوں نے ان گلوں اور شکوں کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ بلکہ یہ باان کے یہاں سب سے پہلے نظر آتی ہے کہ وہ معشوق کی بے وفائی دیکھ کر ایک فرضی محبوب کے حُسن کا ذکر کرتے ہیں۔اس سے دل لگانے اور اس کے دور رہنے کی دھمکی اپنے معشوق کو دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے کئے پر شرمندہ ہو اور عاشق کی طرف دوبارہ توجہ کرلے۔" (ہمان، ۳۴۷) ان کا خیال ہے کہ اگرچہ واسوخت کی ابتدا دہلی سے ہوئی، لیکن اس کا عروج لکھنؤ میں ہوا۔ڈاکٹر گیان چند جین نے "واسوخت امانتؔ" میں امانتؔ لکھنوی کے واسوختوں کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ امانت کے عہد سے واسوخت کے قصیدے کی طرح کئی اجزاء ہونے لگے۔ آگے جاکر وہ امانتؔ کے تین واسوختوں کا جائزہ لیا ہے۔

"ریختی" کی صنف کے تعارف کے لیے ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون "ریختی کا سماجی و تہذیبی پس منظر" دیا گیا ہے۔ انہوں نے شروع میں لکھنؤ کے اس معاشرے کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جہاں ریختی جیسی صنف نے جنم لی۔ وہ اس بات کا

انکار کرتے ہیں کہ "ولی سے پہلے کے بیشتر شعرا کے ہاں غزل میں اظہار عشق عورت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔اس سے بعض نقادوں نے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر قلی قطب شاہ سے شروع ہو کر بہت سے شعرا کے کلام میں ریختی ڈھونڈ نکالی۔ لیکن میرے خیال میں دکنی غزل کا نہ تو ریختی سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی وہ ان سماجی اور نفسیاتی محرکات کی جنم دہندہ تھی جو اس لکھنؤ سے مخصوص ہو چکے ہیں۔" (ہمان،۳۷۱) یوں مصنف نے تفصیل سے لکھنؤ اور دہلی کے ریختی گو شعرا کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔ ریختی کے سلسلے میں ایک اور مضمون "لکھنؤ اور دلّی اسکول کے ریختی گو شعراء" سید تمکین کاظمی کا لکھا ہوا ہے۔ ان کے خیال میں عادل شاہی دربار کا ایک شاعر سید میراں ہاشمی ریختی گوئی کے آغاز کرنے والا ہے۔ اسی طرح ۱۱۰۹ھ سے لے کر ۱۱۵۵ھ کو ریختی گوئی کا پہلا دور قرار دیا ہے۔آگے جا کر وہ دلّی اور لکھنؤ کے شعرا کے ہاں ریختی گوئی کا تذکرہ کرکے ان کا جائزہ لیا ہے۔انہوں نے جابجا ان شعرا کی ریختیوں کے نمونے پیش کیے ہیں۔ ریختی کے ضمن میں ایک اور مضمون "ریختی اور اس کے فنکار" از کوثر چاند پوری ہے۔انہوں نے ریختہ اور ریختی کی تاریخی پس منظر اور مفاہیم کی وضاحت کے بعد، پہلے ریختی گو شاعر کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ بھی سید میراں ہاشمی کو ریختی کا موجود مانتے ہیں۔اس کے بعد دلّی اور لکھنؤ کے شعر کے کلام میں ریختی کے نمونے پیش کرکے ان کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

"قطعہ" کے لیے "قطعہ اور اس کے مماثل اصناف" کے نام سے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ایک مضمون لکھا ہے۔ انہون نے اس مضمون میں پہلے قطعہ کے لیے چند شرطوں کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد رباعی، مثنوی اور غزل جیسی اصناف سے اس کا تقابل کرکے ان کے درمیان اختلافات کا ذکر کیا ہے۔ "گیت" کے بارے میں ایک مضمون "اردو گیت" از اظہر علی فاروقی اس کتاب میں مندرج ہے۔ وہ اردو گیتوں کے بارے میں شروع ہی میں ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں "گیتوں کے ساتھ جب اردو کا لفظ ایک وصفی سابقے کے طور پر لگ جاتا ہے تو ہمارا ذہن فوراًان گیتوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو تقریباً بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں اردو ماہناموں کے ذریعے منظر عام پر آئے اور بہت جلد اردو شاعری کی ایک مستقل صنف بن گئے۔" (ہمان،۴۱۵) ان کے خیال میں اس طرح کے گیت عموماً رومانی ہوا کرتے ہیں۔ اس کے بعد عوامی گیت، اور کتابی گیت اور فلمی گیت جیسے عناوین کے تحت اردو گیتوں کا ایک مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

"شہر آشوب کا فن اور موضوع" از سید مسعود حسن رضوی ادیب، "شہر آشوب" کی صنف کی وضاحت کے لیے دیا گیا ہے۔ مصنف نے مختلف عناوین کے تحت اس صنف کی وضاحت کی ہے۔ مثال کے طور پر "شہر آشوب کی ادبی حیثیت" کے عنوان کے تحت یوں لکھا ہے "شہر آشوب رباعیوں کی صورت میں ہو یا قطعوں کی، مختصر مثنویوں کی صورت میں ہو

یا منفرد شعروں کی، شاعر ان میں لفظی رعایتیں، ذو معنی لفظ اور فقرے اسی طرح کے دوسرے تکلّفات کا استعمال التزاماً کرتا ہے۔ بلکہ اپنے بیان کی بنیاد انہیں چیزوں پر رکھتا ہے۔ اس لئے ان کی حیثیت ادبی لطیفوں سے زیادہ نہیں ہوتی ۔" (ہمان، ۴۳۴) اسی طرح بڑی تفصیل کے ساتھ اردو اور فارسی شہر آشوبوں کا جو مختلف ہیئتوں میں کہے گئے ہیں، اس مضمون میں بہت اچھے طریقے سے مورد مطالعہ واقع ہوا ہے۔

"منظوم ڈرامہ" کی صنف کا، ایک اور شعری صنف کے طور پر اس کتاب میں مطالعہ ہوا ہے۔ پہلا مضمون انگریزی شاعر و مصنف ٹی ایس ایلیٹ کا ہے جس کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے اور دوسرا مضمون "اردو کے منظوم افسانوی ڈرامے" (انیسویں صدی میں) خود ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا ہے۔ انہوں نے اس مضمون میں مختصر طور پر اردو منظوم ڈراموں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں "اردو کا پہلا منظوم ڈرامہ جو محض تاریخی نہیں، بلکہ ادبی و فنی اہمیت بھی رکھتا ہے اور آج تک کتابی صورت میں موجود ہے سید آغا حسن امانتؔ کی اندر سبھا ہے۔" (ہمان، ۴۸۵) اندر سبھا کی ادبی اہمیت اجاگر کرنے کے ساتھ اس کے کرداروں اور واقعات کا تقابل بعض منظوم داستانوں سے بھی کرتے ہیں۔ اس کے بعد کئی اور منظوم ڈراموں اور ایسے شعرا جنہوں نے منظوم ڈرامے لکھے ہیں، کا ذکر کرکے ان کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

"سانیٹ" کی صنف ایک ایسی صنف ہے جو انگریزی ادب سے اردو میں رائج ہوئی ہے۔ پہلا مضمون "سانٹ اور اس کا فن" ڈاکٹر عزیز تمنّائی کا لکھا ہوا ہے۔ اس مضمون میں وہ سانیٹ کی تاریخی حیثیت سے وضاحت کے بعد، مغربی ادب میں مشہور سانیٹ کے شعرا کے سانیٹوں کا ذکر کرکے مختصر طور پر جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس کے بعد اردو ادب میٹ سانیٹ اور اس کی مختلف کیفیات واشکال کا ذکر کرکے راشدؔ، اخترؔ شیرانی جیسے شعرا کے ہاں سانیٹ کی شکلوں کا اختصاراًایک مطالعہ پیش کیا ہے۔ "سانٹ کیا ہے" پروفیسر سید احتشام حسین کا مضمون ہے۔ انہوں نے بہت اختصار کے ساتھ سانیٹ کی ہیئت اور مصرعوں کی ترتیب و تعداد کی نشاندہی کی ہے۔

"دوہا" ہندی شاعری کی ایک صنف ہے جس سے اردو شعرا نے بھی اعتنا کیا ہے۔ سلیم جعفر "دوہا اور اس کی فنی خصوصیات" کے تحت دوہے کی تعریف اور اشکال اور ارکان کی نشاندہی کی کوشش کی ہے۔ "اردو میں پیروڈی" فضل جاوید کا "پیروڈی" کے بارے میں مضمون ہے۔ اس مضمون میں مغربی ادبیات میں پیروڈی کے جائزہ لینے کے بعد، اردو میں کئی پیروڈی نویسوں کی پیروڈیوں کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ وہ اردو میں پیروڈی کے بارے میں یوں کہتے ہیں" یونانی اور انگریزی ادب میں پیروڈی کی ترقی یافتہ شکل دیکھ کر جب ہم اُسے اردو میں تلاش کرتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ دور حاضر سے پہلے ہمارے ادب میں ترقی یافتہ پیروڈی کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ اس کے بعد انشاؔ اور مصحفیؔ کے ہاں پیروڈی

کی ایک شکل نشاندہی کرکے اودھ پنچ کے دور میں اس کی نشاندہی کی گئی ہے اور بعد کے ادوار میں مختلف شعرا کے پاس پیروڈیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا مضمون "اردو میں ہائیکو" اس کتاب کا آخری مضمون ہے۔ ہائیکو جاپانی ادب کی شاعری کی ایک مختصر صنف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "اختصار جاپانیوں کی افتاد مزاج کا ایک حصہ بن گیا ہے۔" (ہمان، ۵۳۷) وہ پہلے ہائیکو کی ہیئت کی وضاحت کرتے ہیں اور پھر جاپانی اور اردو زبانوں کے صوتی نظامات کے بارے میں یوں کہتے ہیں کہ "جاپانی زبان کا صوتی نظام، اردو کے عروضی نظام پر کسی طرح بھی منطبق نہیں ہو سکتا۔ اگر اس سلسلے میں کھینچ تان کیا جائے تو ہائیکو کے صوتی آہنگ کا نظام اردو میں بحر متقارب کے ان ارکان کے مطابق کیا جا سکتا ہے: فعلن فعلن فع = ۵، فعلن فعلن فعلن فع = ۷، فعلن فعلن فع = ۵" (ہمان، ۵۴۲) پھر اردو میں مختلف شعرا کے کلام کے نمونوں کا تنقیدی جائزہ لے کر جاپانی ہائیکو کے اصلی روح کے ساتھ ان کا تقابل پیش کیا ہے۔

مضامین کا تنقیدی مطالعہ

جیسا کہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے کہا ہے یہ کتاب طلباء اور تمام یونیورسٹیوں کی سطح پر اردو کی شعری اصناف کے تدریسی اغراض کو پورے کرنے کے لیے یہ مضامین اکھٹے کیے گئے ہیں۔ غزل اس کتاب کا پہلا موضوع ہے اور یہ سب سے مستحسن کام ہے چونکہ غزل اردو ادب کی آبرو سمجھی جاتی ہے۔ سید عابد علی عابد کا خیال ہے کہ "اردو کی شعری تخلیقات میں غزل کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی تک کے آغاز تک کم و بیش تمام عالی منزلت شعرا نے اپنی لطیف ترین اور دقیق ترین تجربات کے ابلاغ کے لیے غزل کو دوسری تمام اصناف سخن پر ترجیح دی ہے۔" (عابد، ۲۵۹) بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کلاسیکی شعرا سے لے کر عہد حاضر تک کے تقریباً تمام شعرا دیگر اصناف شاعری کے ساتھ ساتھ غزل سے اعتنا کرتے چلے آتے ہیں اور اس کو بیسویں صدی کے آغاز تک محدود کرنا مناسب نہیں۔ اس کتاب میں غزل کے لئے ۶ مضامین مختص ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے مام مصنفوں نے اپنی تمام کوششیں اس پر صرف کردی ہیں کہ غزل کی اہمیت اور اردو میں اس کی کیفیت و نوعیت کی وضاحت کر سکیں۔ ان مضامین میں پروفیسر فراق گورکھپوری نے اپنے طویل مضمون میں کسی منبع اور مرجع کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ ہی کبھی حاشیے میں کسی بات کی مزید وضاحت کی ہے۔ البتہ جہاں اشعار دیئے گئے ہیں، وہاں صرف شاعروں کے نام درج ہیں اور پھر بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ کہاں سے اور اس شاعر کی کونسی کلیات یا دیوان سے یہ اشعار ماخوذ ہیں۔ بہ ہر حال

پروفیسر صاحب کے تنقیدی مضامین کے بارے میں بہت کچھ لکھے گئے ہیں، اس لیے یہاں مزید بات کرنے گنجائش نہیں۔ اس مضمون کے بارے میں جو خیالات پیش ہوئے تقریباً اکثر مضامین پر ان کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر پروفیسر مجنون گورکھپوری کا مضمون "شعر اور غزل" اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور ڈاکٹر مسعود حسین خان وغیرہ کے مضامین تمام کے تمام ایسے ہیں۔ اب سوال یہ پیش آتا ہے کہ کیا یہ اساتذہ جن کی ہمہ دانی پر سب کو یقین ہے، اپنے مضامین میں جن خیالات کے اظہار کئے ہیں وہ سب کے سب ان کے اپنے ہیں؟ کیا انہوں نے کسی کتاب میں سے استفادے نہیں کئے ہیں؟ ایک طالب علم ان مضامین کو علمی انداز سے کس طرح دیکھے گا؟ نہ کتابیات ہیں اور نہ ہی صحیح منابع کی نشاندہی ہوئی ہے۔ بہ ہر حال اس کتاب کی عام خامیوں کو نمبر واریوں کہہ سکتے ہیں کہ:

۱. بعض اصناف کی وضاحت کے لیے کئی مضامین دئے گئے ہیں اور بعض کے لیے ایک یا دو مضامین۔ ظاہر ہے بعض اصناف کی وضاحت کے لیے ایک مضمون کافی نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا مضمون "اردو رباعی کا فنی وتاریخی ارتقا" یا سید مسعود حسن رضوی ادیب کا مضمون "شہر آشوب کا فن اور موضوع" کو لیجیے۔ یہ دونوں مضامین، ان دونوں اصناف کی تفہیم بی۔اے یا ایم۔اے کی سطح کے طلباء کے لیے کافی نظر آتے ہیں۔ البتہ اگر کوئی اس سے زیادہ تحقیق کرنا چاہے تو ظاہر ہے اسے دوسری کتابوں کو دیکھنا پڑے گا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض اصناف کے لیے ایک مضمون سے طلباء کو بات سمجھائی نہیں جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر سلیم جعفر کا مضمون "دوہا اور اس کی فنی خصوصیات" کو لیجیے۔ اس مضمون کی زبان اور اسلوب بیان کسی حد تک مشکل ہے، اس لیے دوہا جیسے مشکل صنف کے لے لیے کم از کم ایک اور مضمون جس میں آسان طریقے سے اس صنف کی وضاحت کی جائے کی ضرورت نظر آتی ہے۔

۲. مضامین کے ضمن میں ایک اور بات یہ ہے کہ چونکہ اکثر مضامین کو مختلف زمانوں میں اور مختلف سطح کے دانشوروں نے اپنے تحقیقی مقاصد کی تکمیل کے لیے لکھے ہیں، اس لیے ایک موضوع کے لیے جو مضامین دیئے گئے ہیں، ان میں کبھی کبھی تکراری باتیں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر غزل کے ایرانی صنف ہونا یا ولی دکنی سے اردو شاعری کا آغاز ہونا۔ پروفیسر مجنون گورکھپوری کا مضمون کا تقابل ڈاکٹر وزیر آغا "غزل اور نظم کا بنیادی فرق" اور شمیم احمد کے مضمون کا تقابل کرکے دیکھیے۔ یا "ریختی" کے لیے ۳ مضامین دئے گئے ہیں جن میں اکثر باتیں تکراری ہیں۔

۳. اس کے علاوہ مضامین کے مصنفوں میں ہر سطح پر فرق کی وجہ سے ہر ایک کے اسلوب بیان اور دلایل پیش کرنے کے طریقے بھی مختلف بلکہ متعدد و متنوع ہیں۔ **اس لیے جب کوئی طالب علم یہ کتاب پڑھنا بیٹھتا ہے تو ایک اسلوب بیان اور طرز نگارش سے اپنا مطالعہ جاری نہیں رکھ سکتا ہے**، بلکہ ہر مضمون میں ایک نئے اسلوب اور نئی طرز سے اس کا سامنا ہوتا ہے۔ شمیم احمد کی زبان اور فراق گورکھپوری کے اسلوب بیان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ اس طرح یہ فرق بیشتر مضامین میں نظر آتا ہے۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ طالب علم کو ان افتراق کی وجہ سے ذہنی یکسوئی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس طرح کی کتابوں کے لیے ضروری ہے کہ تمام مضامین ایک اسلوب دان مصنف کے ہاتھوں از سر نو ایک ہم آہنگ اسلوب کے خاص لکھی جائے۔ یہ کام اکثر رسالوں کے لیے ایک عام عمل ہے۔

۴. اکثر مضامین میں مصنفوں نے منابع و مآخذ کا ذکر نہیں کیا ہے یا اگر کہیں مذکور ہوا ہے تو صحیح پتہ نہیں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ولی دکنی کے دو سفروں کا ذکر کیا ہے، لیکن کہیں بھی یہ نہیں کہا ہے کہ کس کتاب سے انہوں نے یہ مطالب اخذ کیے ہیں۔ یا امیر احمد علوی "اردو کی مشہور مثنویوں میں بہت سے شعرا اور ان کے کلام کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے، لیکن کبھی کسی ماخذ کا نام نہیں ملتا ہے۔ ڈکٹر ابو محمد سحرؔ نے اپنے مضمون "قصیدہ، صنف سخن کی حیثیت سے" میں مآخذ کا ذکر تو کیا ہے، لیکن چونکہ آخر میں کتابیات نہیں، اس لیے صحیح طور پر پتہ نہیں چل سکتا ہے کہ انہوں نے یہ بات اس ماخذ کی کونسی اشاعت سے ماخوذ ہے۔ مثال کے طور پر صفحہ ۲۰۷ سے لے کر ۲۲۰ کو دیکھیے۔

۵. ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے مضامین کی تالیف کرتے وقت، اس پر غور نہیں کیا ہے کہ اس کی ضرورت ہے کہ جہاں سے یہ مضامین لیے گئے ہیں ان منابع و مآخذ کا ذکر کیا جائے۔ مضامین کو پڑھتے وقت اس کا پتہ نہیں چل سکتا ہے کہ کیا مصنفوں نے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے کہنے پر یہ مضامین لکھے ہیں؟ یا نہیں؟ اگر ایسا ہے پھر کیوں بعض مضامین میں جو ایک موضوع کے بارے میں ہیں تکراری موارد ملتے ہیں؟ اگر ایسا ہیں تو انتخاب کے معیارات کیا کیا تھے۔

۶. کتاب کی ایک اور خامی یہ ہے کہ چون کہ یہ مختلف کاتبوں کے ذریعے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اس لیے ان کی لکھاوٹ میں بھی بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ اس لیے بعض کاتبوں نے الفاظ کو صحیح طور لکھا ہے اور بعض غلط۔ مثال کے طور پر صفحہ ۶۴ میں ایک جگہ "عوفی" کا لفظ صحیح لکھا گیا ہے، لیکن اسی صفحے پر عوفی "عونی" لکھا گیا ہے۔ اسی

صفحے پر "ساسانی" کا لفظ ایک جگہ "سامانی" لکھا گیا ہے اور اسی سطر میں "سانی" لکھا گیا ہے۔ شاید مصنف کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ "سامانی" خاندان اسلام کے بعد کا ایک خاندان تھے اور "ساسانی" خاندان اسلام سے پہلے کا ایک خاندان تھا۔ صفحہ ۶۲ میں "مروزی" کا لفظ "مزوری" لکھا گیا ہے۔ اس طرح کی غلطیوں سے قاری ایسی غلطی میں مبتلا ہوتے ہیں جن کا ازالہ بہت مشکل ہوتا ہے۔

۷. بعض اوقات بعض مضامین میں ایسی غلطیاں دیکھی جاتی ہیں کہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مصنف نے اپنا مضمون دوبارہ نہیں دیکھا ہے۔ مثال کے طور پر صفحہ نمبر ۳۱۱ میں "مجمع الفصحا" کا مؤلف "رضا قلی قطب شاہ" لکھا گیا ہے۔ یہ یقیناً کاتب کی غلطی ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود چونکہ اس کتاب میں مختلف اصناف کے بارے میں بہت سی مفید اطلاعات یکجا ملتی ہیں، اس لیے پاک و ہند کی اکثر یونیورسٹیوں میں یہ کتاب سلیبس کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ شعبہ اردو تہران یونیورسٹی میں بھی اس کتاب کے ذریعے بی۔اے آنرز کے ۱۴ یونیٹز اور ایم۔اے اردو کے ۶ یونیٹز کے لیے اس کتاب سے بخوبی فائدہ ملتا ہے اور دیگر کتابوں کے ساتھ اس سے اساتذہ اور طالب علموں کو اصناف شعر کی تفہیم و تدریس میں استفادہ کے بہت سے مواقع میسر آتے ہیں۔

کتابیات

عابد، سید عابد علی، اصول انتقاد ادبیات، ۱۹۹۷ء، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان

فتحپوری، فرمان، اردو شاعری کا فنی ارتقا، ۲۰۰۳ء، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان

فتحپوری، فرمان، اردو ادب کی فنی تاریخ، ۲۰۰۳ء، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان

ہاشمی، رفیع الدین، اصناف ادب، ۲۰۰۳ء، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان